اپنی تربیت

---بدقسمتی سے کچھ لوگوں نے ہمیں اپنا حریف سمجھ لیا ہے حالاں کہ ہم کسی انسان، گروہ، یا فریق کے حریف نہیں ہیں۔ ہم تو معاشرے کی برائیوں کے مخالف ہیں۔ ہماری عداوت شر اور فساد سے ہے۔ ہم انسانوں کے دشمن نہیں بلکہ ہمدرد ہیں۔ اگر ہم نے اصلاح کے لیے کبھی کوئی سخت طریقہ اختیار کیا تو ہمارا رویہ دشمن کا سا نہیں بلکہ اس ڈاکٹر کا سا تھا جو مرض کو ختم کرنے کے لیے مریض سے سختی روا رکھتا ہے۔ محض اخلاص کی بنا پر ہماری تنقید میں سختی تھی۔ ہماری طرف سے کسی کو بدنام کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف توجہ اور اصلاح کی خاطر بنیادی برائیوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ پھر اس کارِ خیر کے لیے ہم اس دعوے کے ساتھ نہیں اٹھے تھے کہ ہم فرشتے اور اس قوم کے صالح ترین لوگ ہیں بلکہ اس معاشرے کی اصلاح کے لیے، جس کے ساتھ ہمارا مرنا، جینا ہے۔ اس خیال سے اٹھے کہ اگر عذابِ الٰہی آیا تو ہم سب میں سے کوئی نہ بچ سکے گا۔ برائیوں کے برے نتائج سے بچنے کے لیے ہم اپنی اور خلقِ خدا کی اصلاح چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے گروہ کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے والوں نے خود اپنا، معاشرے کا اور پوری قوم کا نقصان کیا ہے۔ بہر حال یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں پھر کام کا موقع عطا فرمایا۔

یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے انبیاؑ بھیجے جاتے رہے ہیں۔ انبیاؑ کسی جزوی اصلاح کے لیے نہیں بلکہ کلی اصلاح کے لیے آئے تھے۔ خدا سے بے نیازی اور بغاوت ختم کر کے اس کی بندگی اور قانونِ شرعی کی پیروی کے سوا ہم کوئی اور مقصد نہیں رکھتے۔ اس مقصد کو ہم اوّل روز سے واضح کرتے چلے آئے ہیں۔

یہ ایک اجتماعیت پذیر دور ہے۔ اس میں لیڈر شپ ایک فیصلہ کن عامل کی حیثیت سے سیاسی، فکری، ذہنی اور اخلاقی حیثیتوں سے نظامِ زندگی کو کنٹرول کرتی ہے۔ اسی لیڈر شپ کے مرتب خطوط پر ذہنیتیں بنتی ہیں اور اسی کے مقرر کردہ اصولوں پر زندگی کے شعبے چلتے ہیں۔ عدالت، قانون اور معاش سب پر ان کا کنٹرول ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ گویا جب تک یہ بنیادی تبدیلی نہ ہو، اس وقت تک نظامِ زندگی میں تبدیلی کا امکان نہیں۔ اس سب کچھ کے ساتھ جس حد تک وہ ہمیں مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کا موقع دیں گے، اسی حد تک ہم مسلمانوں کی سی زندگی بسر کر سکیں گے، ورنہ اسلامی زندگی کا دائرہ سکڑتا چلا جائے گا۔ اس سیلاب میں ہم نہ چاہیں گے تب بھی ہمیں چلنا پڑے گا۔ کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ قدم جما کر اس سیلاب میں ٹھہر جائے۔ اسی لیے زندگی کے ہر شعبے میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ صرف سیاسی تبدیلی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ نہیں! ہم ہر شعبے میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ جو کام ہمارے پیشِ نظر ہے وہ جوئے شیر لانے سے زیادہ سخت ہے۔ پہاڑوں کو کاٹنا آسان ہے لیکن یہ کام مشکل ہے۔ یہ کوئی معمولی اور آسان کام نہیں ہے۔

نظامِ تعلیم کی تبدیلی

یہاں سب سے پہلے پورے نظامِ تعلیم کو بدلنے کی ضرورت ہے جو لاکھوں انسانوں کو تبدیل کر رہا ہے۔ معاش، قانون، عدالت، کاروبار، صنعت ---غرض زندگی کے تمام شعبے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جن کے اصولوں، نظریات اور طور طریقوں کو مغربی تعلیم نے تبدیل کر دیا ہے۔ ان حقائق کی موجودگی میں اس نظامِ زندگی کو بدلنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک خیالات اور ذہنوں کو تبدیل نہ کیا جائے۔

اس نظامِ تعلیم نے ہمارے اخلاقی نظریات اور اقدار کو تبدیل کر دیا ہے۔ جسے دین برا سمجھتا ہے وہ ثقافت اور شائستگی بن گئی ہے، اور دین جن کاموں کو بہترین قرار دیتا ہے وہ رجعت پسندی، مولویت اور مضحکہ قرار دے دیے گئے ہیں۔ یہ کیفیت روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ آزادی کے بعد سے اس کی رفتار خصوصاً تیز ہے۔ پہلے باہر کے لوگ ہماری اندرونی زندگی میں دخل نہیں دیتے تھے لیکن اب اپنوں نے ہماری معاشرتی اور اندرونی زندگی میں گھس کر اس رفتار کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ آج سب یہ محسوس کرتے ہیں کہ پہلے ہمارے اخلاق اور معاشرتی زندگی کا اسلام سے اتنا اختلاف نہ تھا، جتنا آج ہے۔ معاشی زندگی اس وقت پہلے سے کئی گنا زیادہ سودی نظام پر مبنی ہو چکی ہے بلکہ وہ تمام چیزیں جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے شدت سے پھیل رہی ہیں۔ ایک آدمی کے لیے حلال روٹی کمانا اور حرام سے بچنا کئی گنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس چیز نے رفتہ رفتہ لوگوں پر مادہ پرستی مسلط کر دی ہے۔ اب انھیں ایک ہی شے مطلوب ہے اور وہ مادی خوش حالی ہے۔ وہ دولت کے پیچھے عزت و آبرو اور ایمان ہر چیز کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اس کیفیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

جہاں ذہن بگڑ جائیں، اخلاقی قدریں تبدیل ہو جائیں، فواحش کی کثرت ہو جائے، فسق وفجور پھیلنے لگے وہاں اسلامی نظام کے قیام میں رکاوٹیں بڑھتی چلی جاتی ہیں، کم نہیں ہوتی۔ یہ کیفیت جیسے جیسے بڑھے گی، اسلامی نظام کا قیام مشکل ہوتا چلا جائے گا۔ اس رفتار کو روکنے کی ضرورت ہے۔

ان لوگوں کا تسلط بڑھتا جا رہا ہے جو اپنے مفاد کو دنیا کی ہر چیز کے مقابلے میں زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں خواہ وہ ایمان، اخلاق، انسانیت اور شرافت ہی کیوں نہ ہو۔ ان حالات کو بدلنے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ حقیقت میں ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھ نہیں آتی کہ اصلاح کیسے ہو سکے گی۔ ایک طرح کی مایوسی ہوتی ہے کہ اس بگاڑ کو درست کرنا کسی طرح ممکن نہیں ---لیکن یہ حقائق کی دنیا ہے اور حقائق کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ مشکلات کا تصور کر لینے کے بعد ایک مسلمان کو سوچنا یہ چاہیے کہ کیا میں سپر ڈال دوں؟ اور یہ سیلاب مجھے بھی بہالے جائے اور آیندہ نسلوں کو بھی، یا اصلاح کی جدوجہد کرنی چاہیے خواہ میں اسی میں ختم ہو جاؤں۔ ہر آدمی کو سوچنا چاہیے کہ کیا مایوسی کا تقاضا یہ ہے کہ بگاڑ کو قبول کر لیا جائے۔ حقیقت میں ایک مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بہر حال اس صورتِ حال کی مزاحمت کی جائے اور جیسی کچھ بھی طاقت ہو اصلاحِ احوال کے لیے جدوجہد کی جائے۔ انبیاؑ پر بھی حالت بدلنے کی ذمہ داری نہیں تھی بلکہ دعوت دینے کی ذمہ داری تھی۔

ناکامی مومن کے لیے نہیں ہے

ایک مومن کا کام کوشش کرنا ہے۔ اللہ کی مرضی اگر ہے کہ اس قوم کو تباہی سے بچائے تو وہ ہماری کوششوں میں طاقت اور برکت عطا فرمائے گا۔ اگر اس کی مرضی نہیں ہے تو بے شک ہم اس دنیا کے نقطۂ نظر سے ناکام رخصت ہوں' اس کے ہاں کامیاب ہوں گے۔ مسلمانوں کی حیثیت سے ہمارا کام اصلاح کی کوشش کرنا ہے۔ ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ وہ اگر کامیابی عطا کرے تو اس کی عنایت ہوگی ورنہ دنیا کی ناکامی کا نام ناکامی نہیں بلکہ آخرت کی ناکامی کا نام ناکامی ہے۔ اس نقطۂ نظر کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اصلاح کے لیے جو کوشش کریں وہ اندھا دھند نہیں ہونی چاہیے۔ یونہی ہاتھ پاؤں نہ ماریں۔ کوشش کا قدرتی تقاضا یہ ہے کہ حکمت اور معاملہ فہمی سے کام کیا جائے۔ قانونِ فطرت کے مطابق جو کوشش کی جائے وہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ آگ جلانے کے لیے سوکھی لکڑیاں ہوں' دیا سلائی ہو اور پھر لکڑیوں کو ہوا ملے تب وہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ کوئی اور طریقہ جو قانونِ فطرت کے مطابق نہ ہو تو اس کے ذریعے سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ بگاڑ کی نوعیت کیا ہے اور کام کس طرح کرنا ہے۔ معاشرے میں کام کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ضروری ہے۔ معاشرے کی اصلاح کے لیے ہمہ گیر' ہمہ پہلو اور قانونِ فطرت کے تقاضے پورے کرتے ہوئے حکیمانہ طریقے سے کوشش کرنی چاہیے۔

انفرادی حیثیت سے مطلوب اوصاف

اوّلین بات یہ ہے کہ جو لوگ اصلاح کی یہ کوشش کرنے کے لیے اٹھیں، وہ پہلے اپنے آپ کو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے تیار کریں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق کے بعد اپنے یہ اوصاف ہی اس راستے میں کام آتے ہیں اور اللہ کی مدد بھی تب ہی آتی ہے جب ان اوصاف کے مطابق کام کیا جائے۔ ہماری تربیت گاہوں کا مقصد بھی ایسے اوصاف پیدا کرنا ہے۔ اگر یہ اوصاف پیدا نہ ہوں تو ہم اصلاح کے لیے اہل اور موزوں نہیں۔

۱- اسلام کا صحیح فہم: ہم اسلام کا نظامِ حیات قائم کرنے کے لیے اٹھے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بجائے خود کیا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کیا ہے؟ اس کی تعلیم کیا ہے؟ دین کے صحیح فہم سے مراد پورا مولوی ہونا ہی نہیں ہے۔ پورے علوم دینی کی تحصیل اگرچہ مطلوب ہے لیکن دینی نظام کے قیام کی خاطر عام آدمیوں کے لیے اتنا دین جاننا ضروری نہیں۔ عرب کے بدو برسوں کی درس وتدریس سے تیار نہیں ہوئے تھے بلکہ انھیں دین کا اتنا خلاصہ معلوم ہو جاتا تھا کہ برائی کیا ہے جسے مٹانا ضروری ہے اور بھلائی کیا ہے جسے قائم کرنا چاہیے۔ دین کے اتنے سے فہم کے ساتھ موجودہ زمانے کی ذلالتوں اور گمراہیوں اور ان کے اثرات سے صحیح آگاہی کافی ہے۔

کارکنوں کے لیے جو تربیتی نصاب مقرر کیا گیا ہے آپ کو چاہیے کہ اس نصاب کو نگاہ میں رکھیں۔ پانچ چھ برس پہلے کی پڑھی ہوئی چیز کو بھی دوبارہ پڑھنا ضروری ہے کیونکہ واقعات کے سطحی مطالعے اور اتار چڑھاؤ سے دماغوں میں کنفیوژن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاج کے لیے تربیتی نصاب کا بار بار مطالعہ ضروری ہے۔

۲-پختگیٔ ایمان: دوسری چیز یہ ہے کہ اپنے اندر ایمان کو زیادہ سے زیادہ پختہ اور مضبوط کریں۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ ہر وقت ایمان کو متزلزل کرنے والی طاقتیں اس طرح مصروفِ کار ہیں کہ پختہ آدمی کا ایمان بھی ہل جاتا ہے۔ کسی مرحلے پر بھی متزلزل نہ ہوں اور ایمان کو اٹل اور مستحکم رکھیں۔

۳- مقصدِ وحید: ہم اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنا مقصدِ زندگی قرار دے چکے ہیں۔ لیکن یہ بات نگاہ میں رکھیں---یہ جماعت کا نہیں بلکہ آپ کا اپنا مقصد ہے۔ بسا اوقات آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ جماعت پر احسان کر رہا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اسے اپنا مقصد سمجھے تو ایسی بات ذہن میں بھی نہیں آ سکتی۔ سمجھنا یہ چاہیے کہ اگر جماعت نہ رہی تب بھی مجھے یہ کام کرنا ہوگا۔ یہ چیز نہایت اہم ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص اسے اپنی زندگی کا مقصد قرار نہیں دیتا تب تک صحیح کام نہیں ہو سکتا۔ اپنا مقصد قرار دے لینے کے بعد اگر کوئی آدمی جماعت چھوڑ بھی دے تو بھی مقصد تو نہ چھوٹے گا۔ اگر کسی شخص کا بچہ بیمار ہو تو وہ بچے کو نہیں چھوڑ سکے گا۔ لیکن کسی دوسرے شخص کے بیمار بچے کے علاج میں وہ کوتاہی برت سکتا ہے اور اپنے گھر بیٹھ سکتا ہے۔ اپنا مقصد قرار دینے والا آدمی جماعت میں ہو یا نہ ہو' مضبوطی کے ساتھ یہی کام کرتا چلا جائے گا۔

۴- یک رنگی: چوتھی چیز یہ ہے کہ ہم اپنے اندر دورنگی' تناقض' تضاد اور منافقت نہ پیدا ہونے دیں۔ ایک دورنگی وہ ہوتی ہے جو معاشرے میں گھرے ہونے کی وجہ سے ناگزیر طور پر آدمی میں پائی جاتی ہے اور دوسری وہ جسے آپ اپنے اختیار سے پسند کریں اور اس پر راضی ہو جائیں۔ دونوں میں فرق ہے۔ مثلاً ایک آدمی ہوش میں آنے پر خود کو گندگی کے تالاب میں گرا ہوا پاتا ہے۔ اب وہ وہیں گندے پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہے۔ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ یہ گندا پانی ہے' وہ اس سے نہیں بچ سکتا۔

اس کے باہر بلاشبہہ گندگی ہے اور یہ ناگزیر ہے مگر قلب میں طہارت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس میں ڈوب کر مر جائے لیکن اس کا قلب پاک ہوگا---اس کے مقابلے میں دوسرا شخص وہ ہے جو خود گندگی میں رہنا چاہتا ہے اور اسے پسند کرتا ہے---دونوں میں فرق ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دانستہ دورنگی کو اپنے اندر نہ آنے دیں جس حد تک آپ کے بس میں ہو۔ کوشش کر کے اپنے آپ کو یک رنگ بنائیں۔ جس کی زندگی میں تناقض اور تضاد ہو اس کا قول اور عمل بے اثر ہوتا ہے۔ آپ کے نظریات اور عمل میں فرق ہوگا تو لوگ آپ کی بات آپ کے منہ پر دے ماریں گے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے کوشش کیجیے کہ جن نظریات کو آپ پیش کرتے ہیں ان کی جھلک آپ کی عملی زندگی میں نظر آنی چاہیے۔

۵- اهلیت پیدا کرنا : پانچویں ضروری چیز یہ ہے کہ اپنے آپ کو ان قابلیتوں سے آراستہ کریں جن کی اس دنیا میں کام کرنے کے لیے ضرورت ہے۔ جس حد تک بس میں ہو خود کو ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے اس قابل بنائیں کہ آپ میں اُس نظامِ زندگی کو چلانے کی اہلیت پیدا ہو، جس کے لیے آپ کوشش کر رہے ہیں۔ جس قابلیت کی بہت بڑی ضرورت ہے وہ حکمت اور دانائی ہے۔

دین کبھی بے وقوفوں کے ہاتھ سے قائم نہیں ہوا۔ اس کے لیے معاملہ فہمی اور معاشرے کی اُلجھنوں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ بات کرنے والے شخص کو سمجھیں۔ اگر اسے نہ سمجھیں گے تو اسے سیدھے راستے پر لانے کے بجائے اُلٹے راستے پر ڈال دیں گے۔ حکمت نہ ہوگی تو بنتے کام کو بگاڑ دیں گے اور اگر حکمت ہوگی تو بگڑتے کام کو بھی سنوار لیں گے۔ اس کے لیے قرآن پاک، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت اور صحابہؓ کی سیرت سے سبق حاصل کریں۔ پھر دنیا کے معاملات کو چلانے کے لیے جو عقل و دانائی درکار ہے اس کو نشوونما دیں۔

ہر آدمی کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ اگر کوئی ساتھی حکمت کے خلاف کوئی کام کر رہا ہو تو اسے بروقت متنبہ کر دیا جائے ---پوری جماعت میں عقل و دانائی کی ضرورت ہے۔ایک آدمی چاہے کتنا ہی دانا کیوں نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر وقت دانائی کے بلند معیار پر قائم رہے۔جماعت بحیثیت مجموعی عقل منداور دانا ہونی چاہیے۔

۲-صبر و حکمت: دوسری صفت صبر کی ہے جو اتنی ہی اہم ہے جتنی حکمت--- دونوں صلاحیتوں کی پہلے بھی تاکید کی جاتی رہی ہے، اور اب بھی کی جارہی ہے۔ جس میں صبر نہ ہو، وہ جلد بازی سے کام کرنا چاہتا ہے لیکن وہ بڑے مقصد کے لیے کام نہیں کر سکتا اور نہ کامیاب ہو سکتا ہے۔موجودہ حالات میں تو صبر کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔حالات کو سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے اور جتنا قدم اٹھانا ناگزیر ہو، اتنا ہی اٹھانا چاہیے۔پھر جو مزاحمتیں اور مخالفتیں ہوں، اگر ان کے مقابلے میں تحمل اور برداشت نہ ہو تو اصلاح کے بجائے خرابی ہوگی۔ایک آدمی میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ سخت اشتعال انگیز حالت میں دماغ کو ٹھنڈا رکھے۔جو کہنے کی بات نہ ہو، زبان سے نہیں نکلنی چاہیے۔پھر بات جتنی کچھ کہنی ہو، اس سے آگے نہ بڑھیں۔ شیطان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دین کا کام کرنے والوں کو غصہ دلائے مگر انھیں صبر و ضبط اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔بے موقع زبان کو نہ کھولیں۔گالیاں سنتے رہیں لیکن جواب میں کچھ نہ کہیں۔اس کے بغیر کام ممکن نہیں ہے۔الزام تراشی کے جواب میں اگر آپ بھی الزام تراشی شروع کر دیں گے تو آپ بھی اسی مقام پر کھڑے ہو جائیں گے جہاں دوسرا فریق کھڑا ہے۔

۷-قربانی کا جذبہ: ایک اور اہم مطلوب صفت قربانی کا جذبہ ہے۔ وقت، مال اور محنت کی قربانی تو دی جا سکتی ہے لیکن سب سے زیادہ سخت قابلیتوں کی قربانی ہے۔ ایک آدمی جب یہ محسوس کرتا ہے کہ مجھ میں شہرت اور منصب حاصل کرنے کی قابلیتیں موجود ہیں، تو اس کے لیے ضبط کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دنیاوی مواقع کو چھوڑ کر قربانی دینا دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ آدمی پیسہ دے جاتا ہے، وقت بھی دے جاتا ہے لیکن ایک ایسے کام میں پڑنا جو دنیاوی لحاظ سے بنجر ہو اور جس میں روٹی چٹنی بھی مشکل سے میسر آئے، کسی آدمی کے لیے حقیقی امتحان ثابت ہوتا ہے۔ یہاں پتا چلتا ہے کہ وہ کس حد تک قربانی دینے کو تیار ہے۔ آپ اپنے اندر جذبۂ قربانی کو بیدار کیجیے۔ یہ اس مقصدِ عظیم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ جس قدر یہ سپرٹ پیدا ہوگی، اتنا ہی زیادہ کام ہوگا۔ اگر قربانی کا جذبہ ہم میں پیدا ہو جائے تو ہم ہزار گنا زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہم میں جذبۂ قربانی کی کمی ہے۔ قربانی کے معنی یہ نہیں کہ اندھا دھند چھلانگ لگا دی جائے --- نہیں! حالات کا جائزہ لے کر اور سوچ سمجھ کر یہ متعین کرنا چاہیے کہ ہمیں اپنی ذات اور اپنے متعلقین کے لیے کتنا کچھ مطلوب ہے۔ اس کے لیے ضرور کوشش کرنی چاہیے۔ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ --- اپنی ذات کا بھی انسان پر حق ہے۔ اپنی ذات کے علاوہ بچوں اور بیوی کا بھی حق ہے۔ ان حقوق کو تلف نہیں کرنا ہے --- غیر معتدل رویہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، جس حد تک اوسط درجے کی زندگی کے لیے ضروری ہو، وہ کافی ہے --- اگر یہ کام ہم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو آپ یقین کریں کہ ہماری جتنی تعداد اس وقت ہے، ہم اسی تعداد کے ساتھ موجودہ حالت کی نسبت بہت زیادہ کام کر سکتے ہیں۔

اجتماعی حیثیت سے مطلوب اوصاف

یہ تمام وہ اوصاف ہیں جو انفرادی طور پر مطلوب ہیں۔ اسی طرح اجتماعی طور پر بھی کچھ اوصاف مطلوب ہیں:

ا- باھمی ھمدردی و خیر خواھی: کوئی جماعت دنیا میں مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک اس کے رفقا اور شرکا میں باہمی محبت نہ ہو۔ محض میل جول کافی نہیں ہے۔ کسی سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے متعلق کوئی برا خیال نہ رکھیں۔ محبت وہ چیز ہے جو لوگوں کو ایک دوسرے سے پیوستہ کرتی اور انھیں بنیان مرصوص بناتی ہے اور محبت کی کمی انھیں پھاڑتی ہے۔ کسی ساتھی میں کوئی برائی محسوس ہو تو وہ دردمندی اور اخلاص کے ساتھ اس سے کہی جائے تا کہ وہ بھی یہ محسوس کرے کہ یہ میری اس برائی پر خوش ہو کر نہیں بلکہ جذبۂ ہمدردی کے تحت کہہ رہا ہے---اس طرح کہیے کہ زخم نہ لگے۔ اگر آپ اس برائی کو دوسروں کے سامنے بیان کریں گے تو یہ محبت نہ ہوگی۔ ایک دوسرے کے متعلق برے خیالات دلوں میں ہوں تو کوئی بھلا کام نہیں ہو سکتا، اور نہ اس طرح کوئی جماعت قائم ہی رہ سکتی ہے۔ باہمی ہمدردی و اخلاص اور خیر خواہی جماعتی زندگی کی اوّلین شرط ہے۔ جب اس چیز کی کمی محسوس ہو تو آپ کو فکر مند ہو جانا چاہیے کیونکہ یہ وہ چیز ہے جس کی تلافی روپے پیسے کی بارش یا دنیا کی کسی دوسری چیز سے نہیں ہو سکتی۔

۲-نظم و ضبط: دوسری اہم چیز نظم وضبط اور سمع و اطاعت کی صفت ہے۔ جب تک نظم اور ڈسپلن موجود نہ ہو، جماعت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کوئی ایسی فوج جسے پکارا جائے اور وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے، وہ کہیں دھاوا نہیں بول سکتی۔ ڈسپلن نہ ہو تو کام نہ ہوگا۔ جن لوگوں کو احساس ہو، انھیں خود بھی بدنظمی سے بچنا چاہیے اور جماعت کو بھی بدنظمی و انتشار سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کوئی کام اپنے ذمے نہ لینا اس سے بہتر ہے کہ ذمے لے کر نہ کیا جائے۔ جو فیصلے جماعت کے اندر ہوں، انھیں تسلیم کرنا کارکنوں کا فرض ہے

۳-باھمی مشورہ: تیسری صفت یہ ہے کہ باہمی مشورے سے کام کیا جائے۔ قرآن اہل ایمان کی صفات کی تعریف کرتا ہے کہ وہ اپنے معاملات کو مشورے سے طے کرتے ہیں۔ بغیر مشورے کے کوئی فیصلہ کرنا جماعتی زندگی کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوتا ہے۔ جس فیصلے میں آپ کی اپنی رائے بھی شامل ہو اس پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے۔ محض دوسرے کی رائے پر خوش دلی کے ساتھ عمل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اپنی رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کریں، اور جن کی رائے کے خلاف فیصلہ ہو وہ اپنی رائے کے خلاف فیصلہ ہونے کے باوجود اطاعت کریں، الا یہ کہ جماعت دین سے باہر ہو جائے۔ جماعت بڑا ظلم کرے گی اگر وہ آزادی رائے کا حق نہیں دے گی۔ لیکن جب اتفاق رائے یا کثرت رائے سے کوئی فیصلہ ہو جائے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی رائے کو نہیں بلکہ جماعت کے فیصلے کو کامیاب کرنے کے لیے زور لگا دے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ خود پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کسی معاملے میں جہاں نصِ صریح موجود ہو وہ تو درست مگر جہاں اجتہاد کا معاملہ ہو وہاں ایک آدمی پوری جماعت کے مقابلے میں زیادہ دانا اور عقل مند نہیں ہوسکتا۔ اکثریت کا فیصلہ تسلیم کر لینا چاہیے۔ مشورے میں پوری آزادی ہونی چاہیے اور ایسا ماحول ہونا چاہیے کہ ہر شخص پوری قوت سے اپنی رائے بیان کر سکے۔ لیکن جب بحثیں ہو چکیں اور اکثریت سے فیصلہ ہو جائے تو لوگوں کا کام ہے کہ اس کے ساتھ چلیں۔

آخر میں دو باتیں اور کہنا چاہتا ہوں---ان تمام اوصاف کو جو بیان کیے گئے ہیں، اپنے اندر انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں ملحوظ رکھیں مگر چند باتیں ایسی ہیں جن سے بڑی شدت کے ساتھ پرہیز کریں۔

کبر و فخر سے اجتناب

پہلی چیز یہ ہے کہ آپ کے اندر کبر اور فخر نہ ہونا چاہیے۔ مجھے ڈر ہے کہ جماعت کے افراد میں اور جماعت کے اندر مجموعی طور پر فخر اور تکبر کی کیفیت پیدا نہ ہو جائے۔ بسا اوقات باتیں کرتے ہوئے' مخالفین اور مخالفتوں کا ذکر کرتے ہوئے مجبوراً ایسی بات کرنی پڑتی ہے جس سے یہ بتانا ہوتا ہے کہ مخالفین جو الزامات و تہمتیں ہم پر لگاتے ہیں' اس کے برعکس ہم میں یہ اور یہ خوبیاں ہیں---ایسے موقعوں پر اگر اس طرح کی کوئی بات کہہ بھی دی جائے تو جائزہ لینا چاہیے کہ کہیں اس میں کبر تو نہیں پایا جاتا۔ جس روز ہم نے سمجھ لیا کہ ہم بڑی چیز ہیں' اسی روز چھوٹی چیز ہو جائیں گے۔ خود پسندی اور تعلّی فرد اور جماعت دونوں کو گرا دیتی ہے۔

ریاکاری سے پرہیز

دوسری چیز جس سے بچنا لازم ہے' وہ ریا کاری' نمود و نمایش اور خلقِ خدا کی تحسین کا معاملہ ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے اللہ کے لیے کرنا ہے۔ کسی کی تحسین کی حاجت نہیں ہے۔ دنیا خواہ تعریف کرے یا برائی' ہمیں بہر حال خدا کا کام کرنا ہے۔ لیکن اگر کام میں ریا آ گیا تو ساری نیکی برباد ہو جائے گی۔ ریا کو حدیث میں شرک کہا گیا ہے' یعنی تحسین چاہنے والا انسان گویا دوسروں کو معبود بنا لیتا ہے اور انھیں خوش کرنے کے لیے کام کرتا ہے۔ جو آدمی خدا کے لیے کام کرنے والا ہے' اسے کسی دوسرے کی جزا مطلوب نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر رفیق ان باتوں کو اپنی گرہ میں باندھ لے اور خالص خدا کے لیے کام کرے۔ (اچھرہ' لاہور میں تربیت گاہ سے خطاب' ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء' رپورٹ: رفیع الدین ہاشمی۔ ہفت روزہ آئین' لاہور' ۶ جون ۱۹۶۵ء)